اپنی روایات زندہ رکھو اور
مستقل ماٹو تجویز کرو

از

سیدنا حضرت میرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

اپنی روایات زندہ رکھو اور مستقل ماٹو تجویز کرو

(فرمودہ 7 نومبر 1953ء)

7 نومبر 1953ء کو لجنہ اماء اللہ مرکزیہ کے ہال میں جامعہ نصرت کا سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات و اسناد منعقد ہوا۔ جس میں تشہّد، تعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور نے فرمایا:-

"یہ ہال عورتوں کا اپنا بنایا ہوا ہے اور میرا خیال ہے کہ سارے پاکستان میں عورتوں کا اتنا بڑا ہال اَور کوئی نہیں۔ بیشک بعض ہال ایسے ہیں جو عورتوں کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں مثلاً وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال لاہور لیکن یہ ہال اُس سے بھی بڑا ہے۔ بہرحال عورتوں کے جو پاکستان میں ہال ہیں یہ ہال ان سب سے بڑا ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری جماعت کی عورتوں کو ہر رنگ میں ترقی کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔

مسلمانوں کی روایات

اسلام کی تعلیم پر اگر غور کیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے اس امر پر خصوصیت سے زور دیا ہے کہ جو اچھی بات ہے وہ لے لو اور جو بُری ہے اُسے چھوڑ دو یعنی ہر ایسی چیز جو تمہارے سامنے آئے اُسے تم محض اس تعصب کی وجہ سے کہ وہ چیز تمہاری نہیں کسی اَور کی ہے اُسے بالکل نہ چھوڑ دیا کرو بلکہ تم یہ دیکھا کرو کہ اس کا کونسا حصّہ اچھا ہے اور کونسا حصّہ بُرا ہے۔ پھر اچھے حصّے کو لے لیا کرو اور بُرے حصّے کو چھوڑ دیا کرو۔ اس قسم کی تقریبات بھی یا تو مسلمانوں نے جاری ہی نہیں کیں اور یا اگر جاری کی ہیں تو محض

دوسرے لوگوں کی نقل کرتے ہوئے جاری کی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے مسلمانوں پر ایک ایسا زمانہ گزرا ہے (اور وہ زمانہ چھوٹا نہیں بلکہ صدیوں کا ہے) کہ انہوں نے اپنے ماضی کے واقعات کو یاد نہ رکھا۔ اُنہوں نے یہ یاد نہ رکھا کہ وہ کن باپ دادا کی اولاد ہیں اور پھر ان باپ دادوں کے کیا اطوار تھے۔ وہ بالکل وحشیوں اور جانوروں کی طرح ہو گئے جو اپنے آپ کو کسی ماضی کے ساتھ وابستہ رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ چنانچہ دیکھ لو جانوروں کا کوئی ماضی نہیں ہوتا اُنہیں پتہ نہیں ہوتا کہ اُن کا باپ کون تھا، اُن کا دادا کون تھا، اُن کا پڑدادا کون تھا لیکن انسان اپنے باپ دادوں کا نام یاد رکھتا ہے۔ مگر مسلمانوں پر ایک ایسا زمانہ آیا جب وہ اپنے ماضی کو بُھول چکے تھے اور وہ اُن جانوروں کی طرح ہو گئے تھے جو اپنے آپ کو کسی ماضی کے ساتھ وابستہ رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور یا پھر وہ غیر لوگوں کے نقّال ہو گئے اور اُنہوں نے اپنے ماضی کی تاریخ کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیا۔ انہیں جو کچھ حصّہ ماضی کی تاریخ کا ملتا تھا اُنہوں نے اُسے بھی نظر انداز کر دیا اور سمجھ لیا کہ ہمیں اپنی سابقہ روایات پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ نتیجہ یہ ہوُا کہ اُن میں انتشار پیدا ہو گیا۔ جیسے دریا میں بہت سی کشتیوں کو آپس میں رسّوں کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے تو اُن پر بچّے بھی چلتے ہیں، جوان بھی چلتے ہیں، مرد بھی چلتے ہیں اور عورتیں بھی چلتی ہیں، گائے، بیل، اُونٹ، گھوڑے اور بکریاں بھی چلتی ہیں لیکن جب کسی جگہ کشتیوں کے رسّے ٹوٹ جاتے ہیں اُن کے بندھن کھل جاتے ہیں تو پھر کوئی کشتی کسی طرف چلی جاتی ہے اور کوئی کسی طرف۔ ایسی کشتیوں سے کوئی مُلک یا کوئی قوم فائدہ نہیں اُٹھا سکتی کیونکہ بندھن ٹوٹ جانے کے بعد کشتیوں میں فاصلہ ہو جاتا ہے اور ہر ایک کی جہت بدل جاتی ہے۔ یہی حال قوموں کا ہے جو قومیں اپنی روایات کو قائم رکھتی ہیں اور اپنے ماضی کو بُھلا نہیں دیتیں اُن کی مثال اُن کشتیوں کی سی ہوتی ہے جنہیں درمیان سے باندھ دیا جاتا ہے اور وہ دریا پر ایک پُل بنا دیتی ہیں اس طرح لوگ اُن سے بہت کچھ فائدہ اُٹھا لیتے ہیں۔ اور جو قومیں اپنے ماضی کو بُھول جاتی ہیں اور اپنی سابقہ روایات کو ترک کر دیتی ہیں اُن کی مثال ان کشتیوں کی سی ہوتی ہے

جن کے درمیان کوئی بندھن نہیں ہوتا اور نہ اُن پر ملّاح سوار ہوتے ہیں بلکہ وہ پانی کی رَو کے ساتھ بہتی چلی جاتی ہیں۔ ایسی کشتیوں سے کوئی انسان، کوئی قوم اور کوئی مُلک فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

پس سابقہ روایات یا باپ دادوں کی حکایات اور اُن کا طور و طریق راہ نمائی کے لئے نہایت ضروری ہیں لیکن بد قسمتی سے مسلمانوں نے اُسے نظر انداز کر دیا جس کی وجہ سے اگر آج ہم اپنے باپ دادوں کا طور و طریق اور اُن کی عادات اور روایات معلوم کرنا چاہیں تو ہمارے لئے مُشکل پیش آجاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحابہؓ سے نیچے اُتر کر ہم اپنے باپ دادا کے حالات کو نہیں جانتے۔ حالانکہ مُلک کے مختلف حالات جو کسی متمدّن قوم پر گزرتے ہیں وہ مسلمانوں کے درمیانی عرصہ میں گزرے صحابہؓ پر نہیں گزرے۔ صحابہؓ چند غریب اور سادہ طبع لوگ تھے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو وہ آپ پر ایمان لے آئے اور پھر اللہ تعالیٰ کی مدد سے اسلام کو پھیلاتے رہے۔ صحابہؓ کے وقت نہ تو متمدّن حکومتیں تھیں، نہ اُن کے وقت میں وہ دفاتر تھے جن کی متمدّن حکومتوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ نہ اُن کے زمانہ میں کوئی تمدّنی ترقی ہوئی یعنی نہ اُن کے زمانہ میں سڑکیں بنائی گئیں، نہ نہریں کھودی گئیں، نہ پُل بنائے گئے۔ اس کے لئے انہیں فرصت ہی نہیں تھی۔ بنو اُمّیہ کے زمانہ میں مسلمانوں کو اس قسم کے کاموں کے لئے فرصت ملی اور اُنہوں نے بہت سا کام بھی کیا لیکن افسوس کہ اس زمانہ کے تمدّنی حالات محفوظ نہیں جس کی وجہ سے ہم اپنے شاندار ماضی سے کٹ گئے ہیں لیکن پھر بھی جو کچھ ہمارے پاس موجود ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم اُسے قائم رکھیں اور اس کے ساتھ رشتہ و تعلق قائم کریں تاکہ ہماری مثال ایک پُل کی سی ہو جائے نہ کہ اُن کشتیوں کی سی جو کسی رسّہ سے بندھی ہوئی نہ ہوں اور پانی کی رَو کے ساتھ ساتھ بہتی چلی جارہی ہوں کیونکہ اُن کا کوئی مصرف نہیں ہوتا۔

مَیں بتا رہا تھا کہ مسلمانوں میں اس قسم کی تقریبات نہیں تھیں یا موجود تھیں تو اُنہوں نے ان سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا لیکن یوروپین لوگوں میں ان تقریبات کا رواج ہے

اور اُنہوں نے اُن سے بہت فوائد اُٹھائے ہیں۔ یوروپین قومیں ایسی تقریبات مناتی ہیں اور ایسے مواقع پر سٹوڈنٹس کے علاوہ ماں باپ یا سٹوڈنٹس کے دوسرے قریبی رشتہ داروں کو بھی بُلا لیتی ہیں۔ ان میں چونکہ پردہ کا رواج نہیں اس لئے اس قسم کی تقریبات پر سٹوڈنٹس کی مائیں بھی آجاتی ہیں اور اُن کے باپ بھی آجاتے ہیں۔ ہمارے ہاں پردہ کا رواج ہے اس لئے یہاں خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدِرَ کے ماتحت لڑکیوں کے ادارے ماؤں کو بُلا لیں اور لڑکوں کے ادارے باپوں کو بُلا لیں۔ اسی طرح ماں باپ یا دوسرے رشتہ داروں کو اپنے بچوں اور عزیزوں کی سکول کی دیواروں کے پیچھے کی زندگی کا علم ہو جاتا ہے۔ ہمارے مُلک میں چونکہ ایسا کوئی فنکشن (Function) نہیں ہوتا جس کی وجہ سے ماں باپ یا دوسرے رشتہ داروں کو اپنے بچوں اور عزیزوں کی سکول لائف دیکھنے کا موقع مِل سکے۔ اس لئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دس پندرہ سال تک اپنے بچوں کی سکول لائف سے اس طرح غافل رہتے ہیں جیسے کوئی مَرد ایک پردہ دار عورت کی زندگی سے ناواقف ہوتا ہے۔ اس طرح باپ بیٹے کے درمیان جو اصلاح کا باہمی تعلق ہے وہ کٹ جاتا ہے۔ اسی طرح لڑکیوں کی تعلیم سے ماؤں کو اتنی ناواقفیت ہوتی ہے جتنی انہیں ایک غیر مُلک کی عورت سے ہوتی ہے باوجود اس کے کہ سکول ان کے پاس ہوتا ہے اور باوجود اس کے کہ سکول عورتوں کا ہوتا ہے جس میں وہ بآسانی جاسکتی ہیں۔ انہیں یہ علم نہیں ہوتا کہ ان کی لڑکیوں کی تعلیم کیا ہے، ان کے کیا حالات ہیں، انہیں کس طرح پڑھایا جاتا ہے۔ اس مغائرت کو دُور کرنے کے لئے یوروپین قوموں نے بعض تقریبات مقرر کر رکھی ہیں وہ سال میں ایک یا دو دفعہ ماؤں کو سکول یا کالج میں بُلا لیتی ہیں اور مائیں اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہیں کہ اُن کی لڑکیاں پڑھ رہی ہیں، کھانا پکا رہی ہیں۔ یا مثلاً ایسے موقع پر کسی لڑکی نے انعام حاصل کیا ہو تو ماؤں کو اس طرح توجہ پیدا ہو جاتی ہے کہ اُن کی لڑکی بھی محنت کرے اور انعام حاصل کرے۔ یا وہ دیکھتی ہیں کہ سکول یا کالج کی لڑکیاں مہذّب اور شائستہ ہیں اور ان کی لڑکی اکّھڑ مزاج ہے، اس کا طور و طریق ان کا سا نہیں تو وہ ادارے سے تعاون کر کے اپنی لڑکی کی اصلاح

کی کوشش کرتی ہیں۔

اپنی ماؤں کو بھی اس تقریب میں لاؤ

پس ایک تو اس تقریب کو اس بات کا ذریعہ بناؤ کہ لڑکیوں کی ماؤں اور ان کی دوسری بزرگ عورتوں کو ان تقریبات میں بلاؤ تاکہ وہ اپنی لڑکیوں کی سکول لائف سے واقف ہوں اور تا وہ تمہارے ادارہ سے تعاون کرتے ہوئے اپنی لڑکیوں کی مناسب اصلاح کر سکیں۔ مجھ پر یہ اثر ہے کہ اس وقت غالباً کالج کی لڑکیوں کے علاوہ سکول کی لڑکیوں کو بُلا لیا گیا ہے یا ان کے علاوہ بعض ان لحاظ والی عورتوں کو بُلا لیا گیا ہے جن کا بُلانا مناسب سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ چاہئے تھا کہ لڑکیوں کی ماؤں یا بڑی عورتوں کو اِس موقع پر خصوصیت سے دعوت دی جاتی کہ وہ یہاں آئیں اور اس تقریب میں شامل ہو کر اپنی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت، اُن کے کام اور طَور و طریق کو خود دیکھیں اور معلوم کریں کہ کیا اُن کی لڑکیاں تعلیمی لحاظ سے ترقی کر رہی ہیں؟

دوسرا فائدہ اس کا یہ بھی ہوتا ہے کہ اس طرح لڑکیوں کے رشتہ داروں کو سکول یا کالج سے محبت ہو جاتی ہے۔ تیسرے جب انہیں اپنی لڑکیوں کی تعلیمی زندگی سے واقفیت ہو جاتی ہے تو اُن میں غیریّت اور اجنبیّت کا احساس باقی نہیں رہتا اور باوجود اس کے کہ اُن کی لڑکیاں سکول کی دیواروں کے پیچھے ہوتی ہیں وہ انہیں اِن دیواروں کے پیچھے سے بھی نظر آتی رہتی ہیں۔

اس تمہید کے بعد مَیں کالج کی منتظمات اور طالبات کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ جیسا کہ مَیں نے ابھی بتایا ہے ٹریڈیشنز (Traditions) نہایت ضروری چیز ہیں۔ ٹریڈیشنز یعنی روایاتِ سابقہ انسان کے مستقبل کے بنانے میں بڑی مُمِدّ ہوتی ہیں اور اس کے ذریعہ انسان کی زندگی کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ دُنیا کے تمام انسان ایک شخص یعنی آدمؑ کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں اور سائنس کی تھیوری کو لے لیا جائے تب بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ تمام قبائل اور قومیں کسی نہ کسی کی نسل سے چلی ہیں۔ پس ساری دُنیا نہ سہی تم قبائل اور قوموں کو ہی لے لو، اُن پر نظر دوڑانے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ

بعض قبیلے بہادر ہوتے ہیں اور بعض بُزدل ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کوئی بہادر اور کوئی بُزدل کیوں ہوتا ہے مثلاً قوموں میں سے بنگالیوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ لڑائی کے قابل نہیں، کشمیریوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ لڑائی کے قابل نہیں۔ حالانکہ وہ بھی آدمؑ کی نسل سے ہیں۔ بنگالی اور کشمیری بھی اُسی آدم کی اَولاد ہیں جس طرح دوسری قومیں پٹھان، راجپوت اور مُغل وغیرہ۔ کشمیری اور پٹھان تو ایک ہی نسل سے ہیں لیکن ایک نسل کی دو شاخوں میں سے ایک شاخ یعنی پٹھان بہادر ہوتے ہیں اور ایک شاخ یعنی کشمیری بُزدل ہوتے ہیں۔ بنگال میں بھی بعض ایسے قبائل ہیں جو لڑائی کے لحاظ سے اچھے ہیں۔ اب اگر ایک نسل کو بھی لیا جائے تب بھی یہ ماننا پڑے گا کہ بنگالیوں میں سے بعض لوگ بُزدل ہوتے ہیں اور بعض بہادر ہوتے ہیں۔

پس تم ان چیزوں سے یہ نتیجہ نکال سکتی ہو کہ اخلاق قوموں میں بدلتے رہتے ہیں۔ اخلاق صرف نسل کے ساتھ نہیں چلتے جاتے بلکہ بعض اَور ذرائع بھی ہوتے ہیں جن سے اخلاق ترقی کرتے ہیں۔ اگر اخلاق نسل سے چلتے تو اُس نسل کے سارے حصّوں میں ایک ہی خُلق ہوتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک حصّے میں کوئی خُلق ہوتا ہے اور دوسرے حصّہ میں کوئی خُلق ہوتا ہے۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ نسل کے علاوہ اَور بھی بعض فیکٹرز، موجبات اور ذرائع ایسے ہیں جو اخلاق پیدا کرتے ہیں۔ وہ فیکٹرز، موجبات اور ذرائع کیا ہیں؟ ان میں سے ایک موجب اور ایک فیکٹر صحبت ہے۔ جس قسم کی صحبت میں انسان رہتا ہے اُسی قسم کے اخلاق کو وہ قبول کر لیتا ہے۔ پھر ایک فیکٹر اور موجب تعلیم ہوتی ہے جیسی تعلیم کسی کو دی جاتی ہے اسی قسم کے اخلاق کو وہ قبول کر لیتا ہے۔ پھر ایک بڑا فیکٹر اور موجب اخلاق کا روایت ہوتی ہے جسے انگریز ٹریڈیشنز (Traditions) کہتے ہیں یعنی ماضی کی روایات کہ فلاں کا باپ ایسا تھا، دادا ایسا تھا، پڑدادا ایسا تھا۔ جب یہ باتیں کسی کے ذہن میں ڈالی جاتی ہیں تو انسان آہستہ آہستہ اُن کو اپنا لیتا ہے اور وہ اس کی طبیعت کا ایک جُزو بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب کا کنٹرول اور قبضہ نسل کی نسبت لوگوں پر زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نسل کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کسی بڑے آدمی

سے چلے۔ ممکن ہے کہ کوئی نسل اور خاندان کسی ایسے فرد سے چلا ہو جو اچھے کیریکٹر کا مالک نہ ہو اور تم اس کے حالات کو سامنے رکھ کر کوئی اچھا نتیجہ اخذ نہ کر سکتی ہو۔ لیکن مذہب جب بھی چلے گا کسی بڑے آدمی سے چلے گا۔ خاندان اور نسل کسی چھوٹے اور ذلیل انسان سے بھی چل پڑتی ہے۔ ایک بُزدل آدمی کے بھی 12 بچّے ہو سکتے ہیں اور پھر ان 12 بچوں میں سے بھی ہر ایک کے 12، 12 بچے ہو سکتے ہیں اور پھر ان کے آگے بچے ہو سکتے ہیں اور جب سَو سال میں وہ دس بیس ہزار افراد تک جا پہنچتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو ایک الگ قوم سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ جب دس، پندرہ، بیس یا پچاس افراد ہوتے ہیں اور انہیں ایک دوسرے کی شناخت ہوتی ہے تو وہ ایک خاندان کہلانے لگ جاتا ہے اور جب جانے بوجھے لوگوں کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے تو وہ قبیلہ بن جاتا ہے اور جب اُن کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچتی ہے تو وہ ایک قوم بن جاتی ہے۔

پس قوم کسی خاص چیز کا نام نہیں۔ قوم محض نام ہے آپس میں تعلق رکھنے والے اور ایک دوسرے کو شناخت کرنے والے لوگوں کے گروہ کا۔ جب جانے بوجھے لوگوں کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچتی ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک الگ قوم شمار کرنے لگ جاتے ہیں اور اپنا ایک نام رکھ دیتے ہیں۔ جب اس نام کی قوم کا آدمی دوسرے کو چلتا پھرتا مِل جاتا ہے تو وہ اس سے چمٹ جاتا ہے کہ اچھا آپ بھی فلاں قوم میں سے ہیں! مَیں بھی اسی قوم میں سے ہوں۔ مثلاً ایک پٹھان کو کوئی اَور پٹھان مِل جائے تو وہ کہے گا اچھا آپ پٹھان ہیں! مَیں بھی پٹھان ہوں۔ یہی دوسری قوموں کا حال ہے۔ غرض اسی طرح لوگ اکٹھے ہوتے جاتے ہیں اور اپنے آپ کو ایک الگ قوم کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ پس ضروری نہیں کہ کسی قوم کی ابتداء کسی بڑے آدمی سے ہوئی ہو۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کی بعض قومیں ایسی دیکھی گئی ہیں جو ابتداء میں بعض معمولی آدمیوں سے چلی ہیں بلکہ بعض قومیں ڈاکوؤں سے چلی ہیں۔ سرگودھا اور جھنگ کے ضلعوں کے بعض قبیلے ایسے ہیں کہ اگر اُن کے ناموں کی تحقیق کی جائے تو پتہ لگتا ہے کہ کسی وقت ان کا مورثِ اعلیٰ ڈاکو تھا۔ اب اگر کسی ڈاکو کی اولاد سینکڑوں یا ہزاروں تک

پہنچ جائے اور وہ ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں تو گو انہیں ایک قوم کہا جائے گا لیکن ایسی قوم کی کوئی ٹریڈیشن یا روایت نہیں ہوتی کہ آئندہ آنے والے ان پر فخر کریں۔ اب یہ بات کہ فلاں قوم کا مورثِ اعلیٰ ڈاکو تھا، اس نے فلاں کی گردن کاٹ لی تھی، فلاں کو اس نے لُوٹ لیا تھا، یہ ایسی بات نہیں جن پر اخلاق کی بنیاد رکھی جائے۔ لیکن مذہب ہمیشہ اچھوں سے چلتا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والے آدمی ڈاکہ مارنے والے، فریب کرنے والے، ظلم کرنے والے، دوسروں کے اموال کھانے والے اور دغاباز نہیں ہوتے۔ وہ عدل و انصاف اور سچائی کو پھیلانے والے ہوتے ہیں۔

مذہب کا ایک فائدہ

پس جہاں مذہب کے اور فوائد بھی ہیں وہاں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اُس کی طرف منسوب ہونے والا بجائے اپنے باپ دادوں سے ٹریڈیشن لینے کے مذہب سے ٹریڈیشن لے لیتا ہے کیونکہ اس کے باپ دادوں کی روایات ایسی نہیں ہوتیں کہ وہ اچھے اخلاق پیدا کرنے کا موجب ہو سکیں۔ اس بارہ میں مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل جب گھوڑے سے گرے تو آپ کی صحت کو سخت دھکّا لگا اور آپ بیہوش ہو گئے۔ لوگوں کو پتہ لگا تو وہ آپ کی خبر لینے آجاتے اور پھر سوال بھی کرتے۔ بیہوشی میں اس قسم کے سوالات کرنے مُضِر ہوتے ہیں اِس لئے ڈاکٹروں نے منع کیا ہوُا تھا کہ آپ کے کمرہ میں کوئی نہ جائے۔ چنانچہ مَیں نے آپ کے کمرہ کے دروازے بند کر دیئے اور نیک محمد خاں صاحب افغان کو مقرر کیا کہ وہ کسی کو اندر نہ جانے دیں۔ نیک محمد خاں احمدیت میں نئے نئے آئے تھے اور افغانستان کے اچھے شریف خاندان میں سے تھے۔ اُن کا باپ ایک صوبہ کا گورنر تھا۔ جب احمدیت قبول کر لینے کی وجہ سے اُن کی مخالفت شدّت اختیار کر گئی اور حالات بگڑ گئے تو وہ قادیان آ گئے۔ اُس وقت اُن کی عمر 16، 17 سال کی تھی۔ اس کے بعد وہ قادیان میں ہی رہے۔ نیک محمد خاں صاحب بہت چُست اور ہوشیار تھے۔ اس لئے مَیں نے انہیں پہرہ پر مقرر کیا اور ہدایت کی کہ وہ کسی شخص کو اندر نہ جانے دیں اور انہیں خاص طور پر بتایا کہ دیکھو بعض دفعہ انسان سے غلطی ہو جاتی ہے کوئی بڑا آدمی آجاتا ہے تو خیال آتا ہے کہ

شاید وہ حکم اس کے لئے نہ ہو۔ اس لئے یاد رکھو کہ کوئی چھوٹا ہو یا بڑا سوائے ڈاکٹروں اور ہم لوگوں کے جو خدمت پر مامور ہیں تم کسی شخص کو اندر نہ جانے دو۔ وہ کہنے لگے بہت اچھا۔ شام کے وقت مَیں آیا تو دیکھا کہ بعض لوگ چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ نیک محمد خاں نوجوان تھے۔ سولہ سترہ سال کی عُمر میں قادیان آئے تھے اور ایک شریف خاندان سے تھے۔ اُن کا باپ ایک معزّز آدمی تھا۔ اس وجہ سے اُن کے پٹھان ہونے میں کوئی شُبہ نہیں تھا لیکن ایک اَور قسم کے پٹھان بھی ہمارے مُلک میں ہوتے ہیں جن کے باپ دادے چار پانچ سَو سال ہوئے اس مُلک میں آئے وہ بھی اپنے آپ کو پٹھان کہتے ہیں لیکن چونکہ ایک لمبا عرصہ گزر جاتا ہے اس لئے یہ پتہ لگانا ذرا مُشکل ہوتا ہے کہ وہ درحقیقت کون ہیں۔ ممکن ہے وہ پٹھان ہوں یا ممکن ہے کسی اَور قوم سے تعلق رکھتے ہوں اور پٹھانوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے پٹھان کہلانے لگ گئے ہوں لیکن کہتے وہ یہی ہیں کہ وہ پٹھان ہیں۔

ہماری جماعت کے ایک دوست اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی ہؤا کرتے تھے۔ اُن کی قوم بھی پٹھان کہلاتی تھی۔ اُن کے باپ دادا کئی سَو سال ہوئے ہندوستان میں آئے تھے لیکن انہیں اپنے پٹھان ہونے پر بہت فخر تھا۔ وہ بھی حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی تیمارداری کے لئے آئے۔ معلوم نہیں اُن کے دل میں حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل کی کتنی محبت تھی لیکن ظاہر وہ یہی کیا کرتے تھے کہ اُنہیں آپ سے بہت بڑی عقیدت ہے۔ جب اُنہوں نے سُنا کہ حضور گھوڑے سے گر پڑے ہیں اور بیہوش ہو گئے ہیں تو وہ گھبرا کر آئے اور اُنہوں نے اندر جانا چاہا۔ دروازہ پر نیک محمد خاں صاحب کھڑے تھے اُنہوں نے اندر جانے سے روکا۔ بعض لوگوں کو اپنی قومیت پر حد سے زیادہ غرور ہوتا ہے۔ اکبر شاہ خان صاحب نجیب آبادی کو بھی اپنی قومیت پر فخر تھا۔ حالانکہ اُن کے باپ دادا کئی سَو سال ہوئے ہندوستان آئے تھے۔ اُنہوں نے کہا مطلب؟ نیک محمد خاں صاحب نے کہا۔ اندر جانا منع ہے۔ اُنہوں نے کہا۔ مَیں نہیں جانتا کس نے اندر جانا منع کیا ہے۔ مَیں ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ وہ پھر آگے بڑھے۔ اس پر نیک محمد خاں صاحب نے انہیں دھکّا دے دیا۔

اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی کو غصہ آیا اور اُنہوں نے کہا تم نہیں جانتے مَیں کون ہوں؟ مَیں پٹھان ہوں۔ گویا وہ چار پانچ سَو سال کی پٹھانی کا رُعب ایک نئے آئے ہوئے پٹھان پر ڈالنے لگے۔ نیک محمد خاں صاحب نئے نئے احمدیت میں آئے تھے اور احمدیت کی وجہ سے اُنہوں نے دُکھ اور تکالیف برداشت کی تھیں اس لئے اُن کا جوش تازہ تھا۔ جس وقت اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی نے کہا کہ تمہیں پتہ ہے مَیں کون ہوں؟ مَیں پٹھان ہوں۔ تو نیک محمد خاں صاحب نے کہا تمہیں پتہ نہیں مَیں کون ہوں؟ مَیں احمدی ہوں۔

اب دیکھ لو جس کی پٹھانیت مشتبہ تھی وہ تو یہ کہتا ہے کہ مَیں پٹھان ہوں لیکن جس کی پٹھانی میں کوئی شُبہ نہیں تھا وہ کہتا ہے مَیں احمدی ہوں۔ حالانکہ ممکن ہے کہ اکبر شاہ خاں صاحب کسی اَور قوم سے ہوں لیکن پٹھانوں میں رہنے کی وجہ سے پٹھان کہلانے لگ گئے ہوں۔ جیسے ایک میراثی کا لطیفہ مشہور ہے۔ جب یہاں انگریزوں کی حکومت تھی تو بعض قوموں کو زمین خریدنے کی اجازت نہ تھی اور بعض کو خریدنے کی اجازت تھی۔ بعض علاقوں میں سیّد زمین خرید سکتے تھے اور بعض علاقوں میں وہ زمین نہیں خرید سکتے تھے۔ بعض علاقوں میں انہیں زمیندار سمجھا جاتا تھا اور زمین خریدنے کی انہیں اجازت تھی لیکن بعض علاقوں میں انہیں غیر زمیندار سمجھا جاتا تھا اس لئے وہ وہاں زمین نہیں خرید سکتے تھے۔ میراثیوں کا ایک خاندان تھا جس کے بڑے بڑے افسروں سے تعلقات تھے۔ اُنہوں نے روپیہ جمع کرنا شروع کیا اور ایک وقت ایسا آیا جب وہ بہت مالدار ہو گئے۔ اب اُنہوں نے خیال کیا کہ یہ اُن کی بے عزتی ہے کہ لوگ اُنہیں میراثی کہیں۔ میراثیوں کے نزدیک "میراثی" دراصل میر آثی ہے یعنی اصل میں وہ ہیں تو سیّد لیکن کسی وقت اُن کے سردار کا کسی گناہ کی وجہ سے بائیکاٹ کر دیا گیا تھا۔ اس لئے لوگوں نے انہیں میراثی کہنا شروع کر دیا۔ بہر حال وہ سیّد بن گئے۔ روپیہ جمع تھا ہی اس لئے اُنہوں نے زمین خریدلی۔ جن لوگوں سے اُنہوں نے زمین خریدی تھی اُن کا ہمسایہ ایک زمیندار تھا۔ وہ مالدار تو نہیں تھا لیکن تھا عقلمند اور حوصلہ والا۔ اس نے اُن کے خلاف

مقدمہ دائر کر دیا اور کہا وارث ہم ہیں یہ لوگ زمین نہیں خرید سکتے اور دلیل یہ دی کہ یہ سیّد نہیں ہیں میراثی ہیں اور چونکہ یہ سیّد نہیں اس لئے یہ زمین نہیں خرید سکتے۔ میراثیوں کا رسُوخ تھا اس لئے اُنہوں نے روپیہ دے کر گواہ پیش کرنے شروع کئے۔ ان گواہوں میں ایک عورت بھی تھی جو زمیندار تھی لیکن تھی غریب۔ میراثی اُس کے پاس بھی گئے اور کہا تم ایک سَو روپیہ لے لو اور یہ گواہی دو کہ ہم واقع میں سیّد ہیں۔ اس عورت نے روپیہ تو لے لیا اور بظاہر گواہی کا وعدہ بھی کر لیا لیکن دل میں یہ فیصلہ کیا کہ وہ اُن کے خلاف گواہی دے گی اور عدالت میں کہے گی کہ یہ لوگ سیّد نہیں میراثی ہیں۔ چنانچہ وہ عورت عدالت میں گئی۔ مجسٹریٹ نے اس سے دریافت کیا تم بتاؤ کیا یہ لوگ فی الواقع سیّد ہیں؟ اس نے کہا ان لوگوں کے سیّد ہونے میں کوئی شُبہ نہیں یہ تو پکّے سیّد ہیں۔ مجسٹریٹ کو قدرتی طور پر شُبہ ہوُا کہ اُس نے پکّے کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے۔ اُس نے دریافت کیا تمہارے پکّے سیّد کہنے کا کیا مطلب ہے؟ اس عورت نے کہا باقی لوگ تو چار چار پانچ پانچ سَو سال سے اس علاقے میں آئے ہوئے ہیں ان کے متعلق تو صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سیّد ہیں یا نہیں لیکن یہ لوگ تو پکّے سیّد ہیں۔ مَیں ذاتی طور پر اِن کے سیّد ہونے کی گواہ ہوں کیونکہ یہ میراثی تھے اور ہمارے سامنے سیّد بنے ہیں۔ اس لئے اِن کے سیّد ہونے میں کوئی شُبہ نہیں۔ چنانچہ زمین اُن سے چھین لی گئی۔

پس اگر روایات محفوظ ہوں تو قبائل اور اقوام کے متعلق تحقیقات کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک یہودی سے پوچھو تو چونکہ اس کی نسل محفوظ ہے اس لئے وہ فوراً یہ کہہ دے گا کہ اتنے سَو سال پہلے میرے دادا کا نام ابراہیم (علیہ السلام) تھا لیکن ایک دوسری قوم والے سے پوچھو تو وہ یہ بھی نہیں بتا سکے گا کہ اُن کا پڑدادا کون تھا۔ غرض کسی قوم کا پُرانا ہونا اور اس کی روایات کا محفوظ ہونا افراد کے اندر بہادری اور جرأت کی صفات پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً راجپوت ہیں۔ راجپوت ایک لڑنے والی قوم ہے۔ اگر ہوشیار والدین ہوں گے تو وہ اپنے بچّے سے ہمیشہ کہتے رہیں گے کہ دیکھو! تمہارے باپ دادا بڑے بہادر تھے، وہ ایسے لڑنے والے تھے، وہ ایسی قربانی کرنے والے تھے،

ان باتوں کا اُس پر اتنا اثر ہو گا کہ جب بھی لڑنے کا موقع آئے گا سُنی ہوئی باتیں اُسے یاد آجائیں گی۔ وہ جان کی پرواہ نہیں کرے گا اور کہے گا کہ جب میرے ماں باپ نے قُربانیاں کی تھیں تو مَیں کیوں نہ قربانی کروں۔ گویا ایک آدمی کو قُربانی کے وقت اس کے ماں باپ پیچھے سے دھکّا نہیں دیتے اور ایک کو چار پانچ سَو سال کے باپ دادے جن کی روایات اُسے معلوم ہوتی ہیں قُربانی کے وقت اُسے آگے کی طرف دھکّا دیتے ہیں۔ اس لئے وہ قربانی اس کے لئے آسان ہو جاتی ہے اور وہ اُسے کر گزرتا ہے۔

مُغلوں کو دیکھ لو قریباً گیارہ سَو سال سے یہ معروف ہیں۔ اس سے پہلے یہ لوگ منگولیا کے علاقے میں رہتے تھے جو ایک برفانی علاقہ ہے۔ اس لئے کسی کو یہ علم نہیں کہ اُن کی وہاں کیا شان تھی۔ تاریخ اس پر بہت کم روشنی ڈالتی ہے۔ گیارہ سَو سال ہوئے یہ لوگ فاتح ہوئے۔ اب ہوشیار مُغل ماں باپ اپنے بچوں پر یہ اثر ڈالتے رہتے ہیں کہ تمہارے باپ دادوں کے یہ کیریکٹر تھے، وہ جنگجو تھے، اُنہوں نے کئی مُلک فتح کئے، اُنہوں نے ایک طرف یورپ کو فتح کیا تو دوسری طرف ہندوستان اور چین تک وہ چلے گئے اور سینکڑوں سال تک اُنہوں نے ان علاقوں کو قبضہ میں رکھا۔ اس لئے تم بھی آگے بڑھو اور دُنیا کو فتح کرنے کی کوشش کرو۔ اِن خیالات کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وقت آنے پر وہ پیچھے نہیں ہٹے گا بلکہ آگے بڑھے گا اور پھر وہ اکیلا نہیں لڑ رہا ہو گا بلکہ اُس کے باپ دادے اُسے پیچھے سے دھکّا دے رہے ہوں گے۔ لیکن ایک ایسی قوم کا آدمی جس کی ہسٹری اور تاریخ محفوظ نہیں، اُسے یہ پتہ ہی نہیں کہ اُس کے باپ دادے شریف تھے یا بدمعاش تھے، بہادر تھے یا بُزدل تھے، وہ میدانِ جنگ میں اکیلا لڑ رہا ہو گا اور اکثر اوقات وہ بُزدلی دکھا جائے گا۔

غرض روایات ایک جتھا بنا دیتی ہیں۔ اس لئے روایتوں کا محفوظ رکھنا قوم کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ اسی لئے یورپ میں سکولوں اور کالجوں نے اپنے اپنے ماٹو مقرر کئے ہوئے ہیں اور طلباء اور پروفیسروں کا کام ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کے اخلاق کو اپنے اندر پیدا کریں اور پھر انہیں دوسروں کے اندر بھی جاری کرنے کی کوشش کریں۔

ہندوستان میں صرف علی گڑھ کالج تھا جس نے اپنی روایات کو قائم رکھنے کی بنیاد ڈالی۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل طلباء ہمیشہ دوسروں سے ممتاز رہے ہیں اور اُنہوں نے بڑی وسیع الحوصلگی دکھائی ہے اور اچھے کام کئے ہیں۔ اسی طرح آکسفورڈ اور کیمبرج کے فارغ التحصیل طالب علم بھی اپنی ٹریڈیشنز اور روایات کو قائم رکھتے ہیں۔ یورپ میں ہر کالج نے اپنا اپنا ماٹو بنایا ہوا ہے۔ یہاں بھی کالج کو اپنا کوئی نہ کوئی ماٹو، مطمح نظر اور مقصد قرار دینا چاہئے اور اُسے ہر وقت سامنے رکھنا چاہئے۔ مثلاً سچائی اور قُربانی ہے۔ اگر یہ ماٹو بنا دیا جائے اور کوشش کی جائے کہ کالج کی سٹوڈنٹس کے اندر یہ اخلاق نمایاں طور پر پیدا ہوں تو اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ جہاں بھی لڑکی جائے گی یہ ماٹو اس کے سامنے آجائے گا اور وہ اس کو پھیلانے کی پوری کوشش کرے گی۔

پھر ماٹو مقرر کرنے کے بعد کالجوں کے منتظمین کتابوں اور کاپیوں پر اس کی مُہریں لگا دیتے ہیں۔ قمیصوں پر گلے کے قریب ویسے نشان لگا دیتے ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ کالج سے نِکل کر ایک نسل تیار ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ پہلے سٹوڈنٹس ہوتے ہیں پھر اُن کی اولاد ہوتی ہے، پھر اُن کے پوتے ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ آگے چلتا چلا جاتا ہے اور انہیں یگانگت اور وحدانیت کا احساس ہوتا جاتا ہے۔ جس طرح خاندان چلتا ہے اسی طرح اس خاندان میں ایک رِیت چلتی چلی جاتی ہے مثلاً آکسفورڈ کا ایک فارغ التحصیل طالب علم جب دوسرے شخص کے کپڑے پر آکسفورڈ کا نشان دیکھے گا تو وہ اس کی طرف دَوڑ پڑے گا اور خوشی سے کہے گا اچھا! تم آکسفورڈ میں پڑھتے رہے ہو۔ چاہے وہ فرانس کا ہو، جرمنی کا ہو یا کسی اَور مُلک کا جب بھی وہ آکسفورڈ کے دوسرے طالب علم کو دیکھے گا وہ اس کی طرف بڑھے گا اور اُسے تپاک سے ملے گا۔ اسی طرح کیمبرج یونیورسٹی کے طلباء کا حال ہے۔

اپنا ماٹو بناؤ

پس تمہیں بھی اپنی ٹریڈیشنز اور روایات قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ تم بھی اپنا ماٹو بناؤ۔ قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ غور کر کے دو تین اخلاق کو لے لیا جاتا ہے اور انہیں ہر چیز پر لکھ لیا جاتا ہے۔ کمروں اور ہال میں اُسے لکھ کر

لگا دیا جاتا ہے۔ کتابوں اور کاپیوں پر اس کی مُہریں لگا دی جاتی ہیں۔ اس سے طالب علم کو وہ باتیں یاد آتی رہتی ہیں اور وہ انہیں ہر وقت اپنے سامنے رکھتا ہے۔ پروفیسر بھی اس کا خیال رکھتے ہیں اور طالب علموں کا بھی کام ہوتا ہے کہ نہ صرف وہ خود انہیں اپنے سامنے رکھیں بلکہ اپنے ساتھیوں میں بھی ان اخلاق کے پیدا کرنے کی تحریک کرتے رہیں۔ پہلے وہ اخلاق ایک مخصوص طبقہ میں ہوتے ہیں پھر آہستہ آہستہ اس سے ایک خاندان بن جاتا ہے۔

پس تم بھی اپنا ایک ماٹو بناؤ۔ شریعت کے بعض ایسے احکام کو لے لیا جائے جن کے نتیجہ میں بعض خاص قسم کے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ یا بعض نقائص مدِّنظر رکھ لو اور انہیں دُور کرنا اپنا مقصد بنالو۔ مثلاً ہمارے مُلک میں محنت کی عادت نہیں جس کی وجہ سے ہمارے سارے کام خراب ہو جاتے ہیں۔ تم اپنے ایک صنّاع کے پاس جاؤ اور اُسے ایک چیز بنانے کو کہو تو وہ مثلاً اُسے آٹھ آنے میں بنائے گا لیکن ایک یوروپین کاریگر کے پاس جاؤ تو وہ وہی چیز ایک آنہ میں بنا دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُنہوں نے محنت کی عادت ڈال کر اپنے ہاتھ کو تیز بنالیا ہے اس لئے اُن کا مزدور جلدی کام کر لیتا ہے اور ہمارا مزدور دیر میں کام کرتا ہے۔

مَیں جب انگلینڈ گیا تو میرے ساتھ حافظ روشن علی صاحب بھی تھے۔ حافظ صاحب کی طبیعت میں مذاق تھا۔ ایک دن وہ سنجیدگی سے مجھے کہنے لگے کہ کیا آپ نے یہاں کوئی آدمی چلتے بھی دیکھا ہے؟ اب بظاہر اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ چلتے تو سارے ہی ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں کے متعلق یہ سوال آپ کو کیوں پیدا ہؤا لیکن مَیں اُن کا مطلب سمجھ گیا اور مَیں نے کہا کہ واقع میں مَیں نے یہاں کوئی آدمی چلتے نہیں دیکھا۔ حافظ صاحب ہنس پڑے اور کہنے لگے مَیں نے یہاں ہر ایک آدمی کو دوڑتے دیکھا ہے۔ اگرچہ وہ بھاگتے تو نہیں لیکن جب وہ چلتے ہیں تو اُن کے پاؤں ہم سے تیز پڑتے ہیں۔ ہمارے ہاں اگر کوئی رستہ سے گزرتا ہے اور وہاں بِھیڑ ہوتی ہے تو کہتا ہے "رستہ چھڈو اسیں اگّے لنگھنا اے"۔ لیکن ان میں سے ہر ایک گزرتا جاتا ہے اور کسی کو اپنے راستہ

سے ہٹانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہم نے ایک عمارت پر مزدوروں کو کام کرتے دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آگ لگی ہوئی ہے اور یہ لوگ اُسے بجھا رہے ہیں۔ مزدور بڑی تیزی سے لوہا اور لکڑی لے جا رہے تھے لیکن یہاں مزدُور اپنی سُستی کی وجہ سے اس کام کو گراں کر دیتے ہیں۔ مَیں تو اِس کا نقشہ اس طرح کھینچا کرتا ہوں کہ اگر کوئی مزدور کوئی چیز لینے جاتا ہے تو وہ اس طرح ٹوکری اُٹھاتا ہے جیسے کسی کی کمر ٹوٹی ہوئی ہو، وہ ہائے کہہ کر ٹوکری اُٹھاتا ہے اور پھر رینگتے رینگتے معمار تک پہنچتا ہے۔ اگر کوئی مزدور اینٹ اُٹھاتا ہے تو پہلے پھُوں پھُوں کرتا ہے۔ پھر دس گیارہ اینٹیں اکٹھی کرتا ہے۔ پھر آرام کرتا اور سستاتا ہے پھر اُٹھاتا ہے اور جُوں کی طرح چلتا ہے اور دس بارہ منٹ میں مِستری تک پہنچتا ہے۔ پھر مستری بھی اسی طرح کرتے ہیں۔ لیکن ایک یوروپین اتنے ہی عرصہ میں دس دفعہ مستری تک چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مالک مزدور کو بہت زیادہ مزدوری دے دیتے ہیں۔

اسی طرح زمیندار ہیں۔ ہمارے ہاں جو پیداوار ہوتی ہے مَیں نے اُس کا یورپ کی پیداوار سے مقابلہ کیا ہے۔ ہمارے مُلک کی پیداوار میں اور یورپ کی پیداوار میں زیادہ فرق نہیں لیکن وہ مزدور کو دس روپے روزانہ دیتے ہیں اور ہمارے ہاں مزدور کو زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ روپیہ روزانہ ملتا ہے۔ گویا ایک یوروپین مزدور ہمارے مزدور سے چھ گُنے سے بھی زیادہ کما لیتا ہے لیکن اتنی زیادہ اُجرت دے کر بھی اُن ممالک میں ہمارے مُلک سے غلّہ زیادہ سَستا بکتا ہے۔ ماہرینِ زراعت سے مَیں نے اس کے متعلق گفتگو کی ہے کہ ان ممالک کی پیداوار ہمارے مُلک کی پیداوار سے ڈیوڑھی ہے لیکن وہ اپنے مزدور کو دس روپے روزانہ دیتے ہیں اور ہم مزدور کو سوا روپیہ یا ڈیڑھ روپیہ دیتے ہیں اتنا فرق کیوں ہے؟ لیکن ان میں سے اکثر مجھے یہ مُعمّہ نہیں سمجھا سکے۔ اس کی اصل وجہ درحقیقت یہی ہے کہ وہاں مزدور زیادہ کام کرتا ہے۔ اگر یہاں ہم سَو ایکڑ پر دس مزدور رکھنے پر مجبور ہیں تو وہاں ایک مزدور ہی کام دے جاتا ہے۔ اس لئے ہمارے مُلک میں تین چار گُنا تنخواہ زیادہ لینے کے باوجود وہ ہمارے مُلک کے مزدور سے سَستا رہتا ہے۔ یہ

سب باتیں محنت کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے ہیں۔ جب تم اپنا ماٹو مقرر کرو گی تو اس پر غور بھی کرو گی مثلاً یوروپین ممالک میں کھانا کھڑے ہو کر پکایا جاتا ہے ہمارے ہاں عورتیں بیٹھ کر کھانا پکاتی ہیں۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ہمارے ہاں کھانا پکانے کا جو طریق ہے اس سے صحت کو نقصان پہنچتا ہے۔ پھر اتنی پھرتی سے کام نہیں ہو سکتا جتنی پھرتی سے کھڑے ہو کر کام ہو سکتا ہے اس لئے یوروپین ممالک میں کھڑے ہو کر کھانا پکایا جاتا ہے۔ اسی طرح کپڑے بھی کھڑے ہو کر دھوئے جاتے ہیں۔ اس طرح بہت کم وقت میں کام ختم ہو جاتا ہے اور پھر اعضاء میں جو ڈھیلا پن بیٹھنے سے پیدا ہو جاتا ہے وہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح کاڑھنے وغیرہ کا کام ہے۔ یوروپین لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ کوئی چیز کتنی خوبصورت کاڑھی ہوئی ہے بلکہ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی چیز کتنے وقت میں کاڑھی گئی ہے۔ ان کے ہاں محنت اصل چیز ہے۔ اگر ایک عورت نے چار گھنٹے میں ایک اچھا پھُول کاڑھا ہو اور دوسری عورت نے چار منٹ میں اس سے ادنیٰ پھُول کاڑھا ہو تو وہ اس عورت کو ترجیح دیں گے جس نے وہ کام چار منٹ میں ختم کر لیا دوسری عورت سے جس نے چار گھنٹہ میں کام کیا۔

پس محنت ایک ایسی چیز ہے کہ اس پر زور دینا اور اس کی عادت ڈالنا کیریکٹر میں ایک خصوصیت پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ شریعت کے احکام پر غور کر کے بعض اور اخلاق بھی نکالے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے دو تین اخلاق کو لے لو اور انہیں اپنا ماٹو قرار دے لو۔ پھر ہال میں، کمروں میں، لائبریری کی کُتب پر، سکول کے رجسٹروں پر سب پر ان کی مُہریں لگالو۔ لباس پر بھی اُسے بطور بیج لگالو، گلے کے بٹن والے حصّہ پر یا بازو پر کوئی جگہ متعیّن کرلی جائے اور وہاں اُسے لگالیا جائے تاکہ آہستہ آہستہ یہ کالج کا ایک مخصوص کیریکٹر بن جائے۔ اگر تم اس طرح کام کرو تو تم عملی طور پر بہت کچھ کرلو گی۔

مَیں نے جو کچھ بتایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تم اپنی پچھلی ٹریڈیشنز کو قائم کرو اور دوسری قوموں کی نقل کم کرو۔ دوسرے اس قسم کی تقریبات میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے طالبات کی ماؤں کو شامل کرو تا انہیں پتہ لگے کہ ان کی لڑکیاں کالج میں کس قسم کی

زندگی بسر کر رہی ہیں۔ تیسرے بعض اخلاق کو اپنا ماٹو قرار دے لو تا وہ تمہارے کالج کی مخصوص روایت بن جائے۔ پھر ہر طالبۂ علم اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے تا کہ دیکھنے والے اُسے ایک نمایاں حیثیت دیں"۔

("مصباح" بابت ماہ نومبر 1955ء)